ادبی مزاحمت:بنیادی مباحث

Literally Resistance: The basic concerns

Muhammad Kamran Shahzad
Lecturer Punjab College Sargodha.

KEYWORDS

Akmal Newspaper
Syed Fakhruddin
Welfare of People
Successful Newspaper
National Situation
Social Situation
Ancient Urdu

DATES

Received	07-01-2022
Accepted	11-02-2022
Published	20-03-2022

QR CODE

ABSTRACT

This article defines resistance and examines literal and terminological concepts of resistance with a critical point of view. In addition, the article discusses in detail, the types of condemnation (individual resistance, collective resistance), cases, scope and impact of resistance on the society. At the end the evolutionary stages of resistance and resistance as a literary term are examined and conclusions, are drawn.

DOI: https://doi.org/10.54064/negotiations.v2i1.38

ملخص:

اس مقالے میں مزاحمت کے لغوی واصطلاحی مفاہیم کو تحقیقی نقطۂ نظر سے جانچ کر مزاحمت کی ایک تعریف متعین کی گئی ہے۔علاوہ ازیں مقالے میں مذمت کی اقسام(انفرادی مزاحمت،اجتماعی مزاحمت)،صورتیں،دائرہ کار اور مزاحمت کے معاشرے پر اثرات کو تفصیلی قلم بند کیا گیا ہے مقالے کے آخر میں مزاحمت کے ارتقائی مراحل اور مزاحمت بطور ادبی اصطلاح پرکھنے کے بعد نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

"انسانی معاشرے میں خیر و شر کا تصور ازل سے چلا آ رہا ہے۔ بعض اوقات خیر شر پر اور بعض اوقات شر خیر پر غالب آ جاتا ہے لیکن جب شر خیر پر غالب آنے کی سعی کرتا ہے تو اس کو روکنے کے لیے قول و فعل کا رویہ اپنایا جاتا ہے۔ اصطلاح میں شر کے خلاف اٹھنے والے اس رویے کو مزاحمت کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ ظلم و ستم کو ایک حد تک برداشت کر سکتا ہے، جب ظلم و ستم حد سے بڑھ جائے تو مزاحمت جنم لیتی ہے، جس کا مقصد معاشرے میں ہونے والے ظلم واستحصال کے خاتمہ، انصاف و مساوات، عام لوگوں کی خوشحالی اور حقوق کے لیے جد وجہد کرنا ہے۔ مزاحمت کی ماہیت پر مزید بات کرنے سے قبل لغوی اور اصطلاحی مفاہیم کا جائزہ لیتے ہیں۔

اُردو زبان میں مستعمل لفظ "مزاحمت" عربی زبان کے لفظ "زحم" سے مشتق ہے، جس کے معنی حریف سے ٹکرانے یا مدافعت کرنا کے ہیں۔[1] اگرچہ مزاحمت کا تعلق عربی زبان سے ہے لیکن عربی میں مزاحمت کے ہم پلہ "مقاومہ" اور "معارضہ" کے الفاظ مستعمل ہیں۔ "مقاومہ" کا لفظ قوم سے مشتق ہے۔ اُردو میں "مقاومہ" کے لیے لفظ "مقاومت" استعمال ہوتا ہے۔[2] اُردو زبان میں مستعمل لفظ مزاحمت، بنگلہ میں اوشُو، بلوچی میں جل وداد، پشتو میں بندیز، پنجابی میں رکاوٹ، سندھی میں مزاحمت اور کشمیری میں رکاوٹ کا روپ دھار لیتا ہے۔[3]

اُردو کی مختلف لغات میں لفظ "مزاحمت" کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

فرہنگ آصفیہ میں اس سے مراد روک ٹوک، تعرض، اٹکاؤ اور ممانعت ہے۔[4]

فرہنگ عامرہ میں مزاحمت کا مطلب کسی پر تنگی کرنے والا ہے۔[5]

فرہنگ تلفظ میں اس کے مطالب رکاوٹ اور مخالفت کے ہیں۔[6]

فیروز اللغات میں مزاحمت سے مراد روک، تعرض اور ممانعت لیا گیا ہے۔[7]

درسی اُردو لغت میں مزاحمت کے معنی روک ٹوک، اٹکاؤ اور ممانعت درج کیے گئے ہیں۔[8]

نُور اللغات کے مطابق رکاوٹ پیدا کرنا، مداخلت کرنا ہے۔[9]

انگریزی میں مزاحمت کا ہم پلہ لفظ "Resistance" ہے۔ جس سے مراد "مزاحمت" وہ عمل ہے، جو کسی بھی حرکت و عمل سے اختلاف کرنا اور طاقت کا استعمال کرنا، رکاوٹ کرنا روکنے کے لیے موثر اقدامات کرنا کے ہیں۔ انگریزی لغت Collions Cobuild میں "Resistance" کی

---

[1] ابو الفضل عبد الحفیظ، **مصباح اللغات** (لاہور: مکتبہ قدّوسیّہ، 1999ء)، 321۔

[2] فیروز الدین، **فیروز اللغات** (لاہور: فیروز سنز، 2010ء)، 1272۔

[3] اشفاق احمد، **ہفت زبانی لغت** (لاہور: مرکزی اُردو بورڈ، 1974ء)، 653۔

[4] سید احمد دہلوی، **فرہنگ آصفیہ، جلد دوم** (لاہور: اردو سائنس بورڈ، 2003ء)، 339۔

[5] عبد اللہ خان خویشگی، **فرہنگ عامرہ** (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ، 2004ء)، 526۔

[6] شان الحق حقی، **فرہنگ تلفظ** (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 2012ء)، 861۔

[7] فیروز الدین، **فیروز اللغات** (لاہور: فیروز سنز، 2010ء)، 1238۔

[8] انوار احمد، **درسی اُردو لغت** (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 2012ء)، 1290۔

[9] نور الحسن نیر، **نوُرُ اللغات** (لاہور: سنگ میل پبلشرز، 2014ء)، 1245۔

تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:"تبدیلی کسی چیز کو قبول کرنے سے انکار کرنے کا عمل اور اس کو وقوع پذیر ہونے سے روکنے کی کوشش کے عمل کو مزاحمت کہا جاتا ہے"[10]

اوکسفوڈ امریکن ڈکشنری کے مطابق "Resistance" کی تعریف ہے:"کسی چیز کو ماننے یا تعمیل کرنے سے انکار، کسی عمل یا دلیل سے کسی چیز کو روکنے کے عمل کو مزاحمت کہا جاتا ہے۔"[11]

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نے لفظ "Resistance" کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:"یورپی تاریخ میں زیرزمین مزاحمت سے مراد وہ متنوع اور پراسرار گروہ (کی کارروائیاں) ہیں۔جنھوں نے جنگِ عظیم دوم کے دوران یورپ کے جرمن مقبوضات پر نازی (جرمن) حکمرانی کی مخالفت کی"[12]

محولا بالا انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی تعریف سے معلوم ہوتا ہے۔مزاحمت کا لفظ دوسری جنگ عظیم کے دوران اس وقت استعمال ہوا، جب یورپ کے متعدد ممالک پر جرمنی نے قبضہ کر لیا تھا۔کئی افراد نے خفیہ طور پر غاصب جرمن افواج کے خلاف جدوجہد شروع کر دی، جس کے نتیجے میں مزاحمتی تحریک نے جنم لیا۔

مزاحمت کا لفظ سائنس کی شاخ طبعیات میں بھی استعمال ہوتا ہے۔اس اصطلاح کو برقی رو کی مزاحمت کے لیے استعمال کیا گیا، جس کو لفظ (R) سے واضح کیا جاتا ہے Concise science dictionary کے مطابق:"مزاحمت اس طرح ہے، جس طرح الیکٹرک چارج کی باہمی مخالفت کی پیمائش ہوتی ہے"[13]

مزاحمت وہ عمل ہے، جس میں کسی کام میں رکاوٹ ڈالنے، کسی ناانصافی کو برداشت کرنے سے انکار کرنے اور ظلم کے خلاف سیسہ پلائی دیوار کی مانند ڈٹ جانا ہے۔مزاحمت مثبت اور منفی دونوں طرح کی ہوتی ہے۔کوئی بھی انسان اپنے گردونواح کے ماحول میں رہتے ہوئے غیر انسانی رویوں کے خلاف جو رویہ اپناتا ہے۔وہ مزاحمت کی ہی صورت ہے۔ڈاکٹر طارق کلیم کے مطابق جبر کی تین صورتیں ہیں اول جب کوئی بیرونی قوت حملہ آور ہو جائے۔دوسری صورت ریاستی جبر ہے اور تیسری صورت جب معاشرے کا سیاسی و سماجی نظام خطرے کی زد میں آجاتا ہے۔[14] ان صورتوں میں فرد یا معاشرہ مزاحمتی رویہ اپناتا ہے۔اُردو میں مزاحمت کے متبادل الفاظ مستعمل ہیں، جن میں احتجاج،بغاوت، ممانعت، مدافعت، انحراف، تعرض اور رکاوٹ وغیرہ شامل ہیں۔

احتجاج کے لغوی معنی اعتراض اور انکار ہے۔[15] احتجاج کسی بھی صاحبِ اقتدار یا حکومت وقت کے خلاف کیا جاتا ہے۔احتجاج متعدد طریقوں سے کیا جاتا ہے، جن میں ایک طریقہ کسی فرد یا گروہ کی کسی ناپسندیدہ عمل یا بات کے خلاف تقریر یا تحریر کے ذریعے ناراضگی کا اظہار ہے یعنی کسی بھی خطے کی ریاست کی طرف سے یا کسی بھی عوامی گروہ کی جانب سے غیر تسلی بخش صورت حال کے خلاف مختلف انداز میں آواز بلند کرنا ہے۔احتجاج کا

[10]*Collins Cobuild English Dictionary*, (New Delhi: Harper Collins,1991), s.v. "Resistence."
[11]*Concise Oxford American Dictionary*, (Oxford: Oxford University Press, 2006), s.v. "Resistence."
[12] *Enclycopaedia of Bartanica*, Vol. 9, s.v. "Resistence"
[13]*Concise science dictionary,* (Oxford: Oxford Unvercity Press,1984), s.v. "Resistence"
[14]طارق کلیم، **اُردو کی ظریفانہ شاعری میں مزاحمتی عناصر** (کراچی: انجمن ترقی اُردو، 2018ء)، 51۔
[15]فیروز الدین، **فیروزاللغات** (لاہور: فیروز سنز، 2010ء)، 72۔

اصطلاحی مفہوم ڈاکٹر احمد صغیر اپنی کتاب "جدید اُردو افسانوں میں احتجاج کی بازگشت" میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: "احتجاج اس جذبے اور خیال کو کہتے ہیں، جو انسان کے دِل و دماغ میں کسی کے خلاف پیدا ہوتا ہے"[16]

احتجاج کی مثال پاکستان کی موجودہ سیاسی صورتِ حال سے واضح ہوتی ہے۔ قومی اسمبلی میں حکومت کی طرف سے اگر کوئی متنازعہ بل منظور کرنے کے لیے پیش کیا جائے گا تو حکومت مخالف جماعتوں کا شور وغُل، بل کی کاپیاں پھاڑ دینا اور واک آؤٹ کرنا بھی احتجاج کہلائے گا۔ اگر اس بل کا تعلق کسی نہ کسی صورت میں عوام کی زندگی یا ان کے مذہبی لگاؤ کے ساتھ ہو تو عوام ملک میں ہڑتال، جلسے تقاریر اور املاک کی توڑ پھوڑ کر کے احتجاج کرتے ہیں۔ احتجاج کرنے والے عوام اس کے نتائج سے نابلد ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے معاشرتی سطح پر عام زندگی گزارنے والے افراد بری طرح متاثر ہوتے ہیں اور انھیں کئی طرح سے نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

احتجاج کے ذریعے جب مسائل کا حل نہ نکلے تو بغاوت جنم لیتی ہے۔ بغاوت کے لغوی معنی سرکشی، نافرمانی، غداری کے ہیں۔[17] حکومتِ وقت کے خلاف اجتماعی طور پر قانون شکنی، ایجی ٹیشن، بلوہ، لوٹ مار، تشدد اور فساد کے ہیں۔[18] اصطلاحی طور پر کسی نظام کے خلاف ٹکراؤ یا کسی بھی رسم ورواج کے خلاف مہم کو بغاوت کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی طرح حکومتِ وقت یا کسی ریاستی ادارے کا حکم نہ ماننا یا اطاعت نہ کرنا بھی بغاوت کے زمرے میں آتا ہے۔ جن ممالک میں حکومت عوامی استحصال کر رہی ہو وہاں عوام کی طرف سے مخفی یا ظاہری طور پر چھوٹی بڑی بغاوتیں جنم لیتی رہتی ہیں۔ بغاوت کا اظہار سب سے پہلے قدیم یونانی ادب میں ہوا، جس کی سب سے بڑی مثال مشہور فلسفی سقراط کی ہے جسے حق بات کہنے کی پاداش میں زہر کا پیالہ پلا دیا گیا۔ سقراط نے زہر کا پیالہ تو پی لیا لیکن وہ اپنے عقائد سے نہ ہٹا۔ یوں اس نے آنے والے زمانے میں لوگوں کو یہ شعور دیا کہ حق بات پر ڈٹ جانا اور جان قربان کر دینا انسان کو امر کر جاتا ہے۔ یہ مزاحمت کی مثال تھی۔

انقلاب کسی سماجی ناہمواری کے خلاف لوگوں کا باقاعدہ تحریک کے ذریعے مقاصد کا حصول ہے یعنی انقلاب کسی بھی کام کو نئے سانچے میں ڈھالنے کا نام ہے۔[19] انقلاب کے لغوی معنی تغیر و تبدل، گردش، زمانے کا چکر کھانا، پرانے سیاسی یا معاشی نظام کی جگہ نئے نظام کا نفاذ کے ہیں۔[20] انقلاب کسی بھی ملک کے داخلی دستور کو از سرِ نو بنانے کے لیے اس ملک کے باشندوں کے ذریعے آتا ہے۔ جب کسی بھی ملک کا حاکمِ وقت عوام کے بنیادی حقوق کا استحصال کرتا ہے تو عوام اس استحصالی دور کے خاتمے کے لیے انقلاب لاتے ہیں۔ انقلاب ایک کامیاب بغاوت ہوتی ہے، جو مکمل طور پر حکومتی پالیسوں کو تبدیل کر دیتی ہیں۔ انقلاب اور بغاوت ہم معنی الفاظ ہیں ان میں فرق ہے تو صرف اتنا کہ کامیاب ہو جائے تو انقلاب کہلاتا ہے اور ناکام ہو جائے تو بغاوت کہلاتی ہے۔ انقلاب کی کئی صورتیں ہوتی ہیں، جن میں معاشی، سیاسی، صنعتی اور اقتصادی انقلاب وغیرہ شامل ہے۔

ادب میں عمومی طور پر انقلاب، بغاوت اور احتجاج جیسی اصطلاحوں کو مزاحمت کے متبادل لفظ سمجھا جاتا ہے۔ علی جاوید اپنی کتاب افہام و تفہیم میں ان اصطلاحوں کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

---

[16] احمد صغیر، **جدید اُردو افسانوں میں احتجاج کی بازگشت** (نئی دہلی: مکتبہ استعارہ، 2003ء)، 151۔

[17] **اُردو لغت تاریخی اصولوں پر، جلد اول** (کراچی: ترقی اُردو بورڈ، 2013ء)، 241۔

[18] سید احمد دہلوی، **فرہنگ آصفیہ، جلد اول** (لاہور: اردو سائنس بورڈ، 2003ء)، 398۔

[19] اشفاق احمد، سعادت سعید، **اُردو میں مزاحمتی شاعری (تاریخ اور تجزیہ)** (لاہور: شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، س۔ن ء)، 24۔

[20] فیروز الدین، **فیروز اللغات** (لاہور: فیروز سنز، 2003ء)، 131۔

"انقلاب، بغاوت اور احتجاج ایک دوسرے کے قریب ضرور ہیں لیکن ان میں بہت فرق ہے۔۔۔۔۔۔۔انقلاب کے معنی کسی سماج کی معاشیات کے پیداواری رشتے میں مکمل تبدیلی یا دوسرے الفاظ میں کسی سماجی ڈھانچے میں مکمل سماجی، سیاسی اور معاشی تبدیلی کے ہیں۔ انقلاب کے لیے عمل پیہم ضروری ہے اور انقلاب کا تعلق کسی باقاعدہ تحریک سے ہوتا ہے جس کے مقاصد پہلے سے طے ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی انقلاب کے لیے انقلابی شعور کا ہونا لازمی ہے جبکہ احتجاج کسی بھی سماجی نظام یا تحریک سے ناراضگی کا رد عمل ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔۔اس کے علاوہ احتجاج کسی بھی شئے کے خلاف اسے ختم کرنے کا راستہ ہموار نہیں کرتا۔۔۔۔ جس طرح انقلاب اور احتجاج میں فرق ہے ویسے ہی بغاوت اور احتجاج بھی معنوی سطح پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کسی نظام کے خلاف ٹکراؤ یا کسی بھی رسم یا رواج کے خلاف مہم کو بھی بغاوت کا نام دیا جاسکتا ہے۔۔۔۔ جبکہ احتجاج کسی شے سے لاتعلقی یا ناراضگی کا اظہار ہے جو مقابلہ کی حد تک نہیں پہنچتا اور نہ ہی کسی ناپسندیدہ شئے سے نجات پانے کا راستہ ہموار کرتا ہے"[21]

مزاحمت یا بغاوت کسی نظام کے خلاف بھی ہو سکتی ہے اور ملک یا حکومتی پالیسیوں کے خلاف بھی۔ اس کے برعکس احتجاج میں رویہ اس حوالے سے مختلف ہو سکتا ہے کہ یہاں پر امن حالات میں غریب اور متوسط طبقہ کی املاک بھی نشانہ بنتی ہیں۔ علی رفاد رفتیجی اپنے مضمون "مزاحمت کی شعریات" میں مزاحمت اور احتجاج میں فرق واضح کرتے ہیں: "مزاحمت ایک مضبوط اختلاف کا اظہار ہے۔ اسی طرح مزاحمت بنیادی طور پر ایک انقلابی سرگرمی ہے۔ اس کے برعکس احتجاج کی اصطلاح میں ایک سے زائد تجربے اور اس کی توانائی کا پہلو شامل ہوتا ہے۔ گویا احتجاج اور مزاحمت کے درمیان فرق یہ ہے کہ احتجاج روایتی طور پر منصوبہ بند، منظم، منضبط، شعوری اور اجتماعی ہوتا ہے۔۔۔۔۔ دوسری جانب مزاحمت غیر منصوبہ بند، غیر منظم غیر شعوری انفرادی عمل ہے"[22]

ان الفاظ کے علاوہ فرار کا لفظ بھی مزاحمت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر ہر انسان اس چیز یا قوت سے فرار اختیار کرتا ہے۔ جس سے انسان ڈرتا ہے۔ فرد کے خون میں ہیجانی رد عمل کی وجہ سے فرد میں تمام خطرناک اور تکلیف دہ اشیا اور واقعات سے گریز کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ فرار انسان کی فطرت کا حصہ ہوتا ہے۔ کوئی بھی فرد نفسیاتی طور پر جس چیز سے ڈرتا یا خوف کھاتا ہے۔ اس سے راہ فرار اختیار کرتا ہے۔ فرار میں انسانی مقاصد ترک ہو جاتے ہیں۔ بعض انسان اپنے نفس سے فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں اور افراد سماجی تعلقات کو ترک کر کے اپنی ذات تک محدود ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی سماجی اور معاشرتی اقدار سے فرار کی راہ ہے۔ "وہ عوام میں مزاحمت کی قوت اور زندگی کی دُشواریوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کرتا ہے۔ تاکہ عوام سماجی حالت موجود سے نکل کر معاشرے کی از سر نو تشکیل کر سکیں"[23]

بعض اوقات انسان موجودہ حالات اور مسائل کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتا تو خود کو بچانے کی خاطر وہ تخیل کی ایک دنیا آباد کر لیتا ہے۔ یوں وہ مسائل سے خود فرار اختیار کر کے اپنی آباد کی ہوئی تخیلاتی دنیا میں پناہ لے لیتا ہے۔ یہ بھی مزاحمت کا ایک پہلو ہے۔

چونکہ مزاحمت ایک فطری عمل ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ مزاحمت ایک رویہ ایک احساس ہے، جو کہ تخلیقِ آدم سے انسان کی سرشت میں موجود ہے اور یہ ہمیں کائنات کے ہر گوشے میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ وہ سوچ اور رویہ ہے جو کہ انسان کو کسی نہ کسی ظلم، تشدد، جبر، ناانصافی، معاشی و سماجی استحصال کے خلاف نبرد آزما ہونے پر اکساتا ہے یعنی یہ سماجی اور سیاسی رویوں سے انکار کا نام ہے۔ روبینہ سہگل مزاحمت کی وضاحت کرتی

---

[21] علی جاوید، **افہام و تفہیم** (دہلی: رائٹرز گلڈ، 2000ء)، 47۔

[22] Girling, D.A. *New Age Encyclopedia*. Seventh edition. Sydney: Bay Books, 1983.

[23] ثاقب رزمی، **ترقی پسند نظریہ ادب کی تشکیل جدید** (لاہور: آئینہ ادب، 1987ء)، 161-162۔

ہیں: "مزاحمت ہر ایسے عمل، سوچ رویے یا طریقِ کار کو کہا جا سکتا ہے جو کسی نا انصافی، ظلم، تشدد و بربریت یا جبر کے خلاف کیا گیا ہو۔۔ مزاحمت سے مراد ہے کسی چیز کو روکنا، کسی ظلم کی مخالفت، کسی ناانصافی کو برداشت کرنے سے انکار کرنا اور عملی اور متحرک انداز میں کسی ظلم کا سدباب کرنا"[24]

انسان جذبہ حریت، شخصی آزادی اور عزتِ نفس کے احساس کے ساتھ تخلیق کیا گیا ہے، جب بھی اس کے لطیف جذبات و احساسات پر ضرب پڑی وہ ان حریفوں کے خلاف مزاحمت کرتا نظر آتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انسان اپنی جسمانی اور روحانی بقا کے لیے مسلسل جدوجہد کرتا رہا ہے۔ اس کی یہ جدوجہد لاتعداد پہلوؤں پر محیط ہے۔ روبینہ سہگل نے اپنی کتاب "عورت اور مزاحمت" میں مزاحمت کو نوعیت کی لحاظ سے دو اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ جب کہ مزاحمت کی عملی طور پر دو صورتیں ہیں۔ نوعیت کے اعتبار سے مزاحمت کی اقسام درج ذیل ہیں

1: انفرادی مزاحمت 2: اجتماعی مزاحمت

انفرادی مزاحمت

انفرادی مزاحمت کا تعلق فردِ واحد سے ہوتا ہے۔ سماج میں کسی بھی شخص کو ذاتی نوعیت کے ظلم و ستم استحصال اور محرومی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ اپنی ذات کے تحفظ کے لیے مزاحمتی رویہ اپناتا ہے۔ بعض اوقات ارد گرد کے ماحول سے خطرہ در پیش ہوتا ہے، جب انسان ہی انسان کا دشمن بن جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم تاریخی کردار قابیل اور ہابیل کی مثال دے سکتے ہیں۔ جنھوں نے دنیا میں انسانیت کے خون کرنے کا آغاز کیا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ دوسری مثال ایسے ظالم آقا کی مثال ہے، جو اپنے غلام پر مختلف انداز میں ظالمانہ عمل کرتا ہے تو غلام ردعمل کے طور پر اس ظالمانہ رویے کے خلاف مزاحمت کرتا ہے۔ روبینہ سہگل نے بھی اپنی کتاب میں غلاموں کی بغاوت کی مثال دی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

"قدیم زمانے سے غلاموں کی آزادی کی بغاوتیں مشہور ہیں۔ زنجیروں میں جکڑے ہوئے غلاموں نے مل کر غلامی کے خاتمے کے لیے بغاوت کی۔۔۔ کیونکہ غلاموں کو انسان تصور نہیں کیا جاتا تھا اور ان پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ ان بغاوتوں میں سب سے مشہور بغاوت 71 تا 73 قبل مسیح میں ہونے والی سپارٹکس کی ناکام بغاوت ہے جس میں رومیوں نے غلاموں کو تختہ دار پر لٹکا دیا"[25]

چونکہ انسان فطری طور پر مزاحمتی رویہ لے کر دنیا میں آتا ہے اس لیے سماجی جانور ہونے کے ناطے سماج میں رائج نظام کے خلاف ہوتا ہے۔ اس معاشرہ میں ایسے متعدد عمل کرتا ہے جو انسان کی فطری صلاحیتوں کو دبانے کے جتن کرتے ہیں۔ ہر انسان مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ قدیم دور میں انسانی وسائل محدود ہونے کے نتیجے میں انسان وسائل کے حصول کے لیے انسان کا ہی دشمن بن جاتا ہے۔ معاشرہ فرد کو ایسے عمل سے روکتا ہے تو ردعمل کے طور پر انفرادی مزاحمت ہوتی ہے۔

انفرادی مزاحمت کا ایک پہلو تخیلاتی دنیا میں فرد کا پناہ لینا بھی ہے، جیسا کہ پہلے بھی اس پر گفتگو ہو چکی کہ مسائل سے نبرد آزمانہ ہونے کا حوصلہ رکھنے والے خود تخیل میں ایک ایسی دنیا آباد کر لیتے ہیں، جو ان کی خواہشات کے عین مطابق ہوتی ہے۔ اس دنیا کے وہ بادشاہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایسی دنیا بسا کر وہیں رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ خود سے فرار انفرادی طور پر مزاحمت کی ہی ایک صورت ہے۔

---

[24] روبینہ سہگل، **عورت اور مزاحمت** (لاہور: مشعل پبلی کیشنز، 1999ء)، 19۔

[25] **ایضاً**، 23۔

اجتماعی مزاحمت:

معاشرے کا ایک طبقہ جب مشترکہ طور پر کسی جبر، ظلم، زیادتی یا استحصال کا شکار ہو تو وہ مل کر اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور اپنی بقا کے لیے مزاحمت کا راستہ اپنائیں تو یہ مزاحمت کی اجتماعی صورت کہلائے گی۔ اجتماعی مزاحمت میں مقاصد واضح ہوتے ہیں:

"اجتماعی مزاحمت بہت سے افراد، جو کسی ظلم و ستم کا اکٹھے شکار ہوں، مل کر کرتے ہیں۔ اجتماعی مزاحمت کے لیے ضروری ہے کہ بہت سے افراد کسی ظلم کی اجتماعی شکل کو پہچانیں، آپس میں یک جہتی محسوس کریں اور اس بات کو تسلیم کریں کہ یہ ظلم سب کے خلاف ہے"[26]

اجتماعی مزاحمت کے حوالے سے تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ دنیا میں سب سے بڑی مثال نو آبادیاتی نظام کے خلاف اٹھنے والی تحریکیں ہیں۔ جہاں جہاں قابضین نے نو آبادیاتی نظام کے تحت پسماندہ ممالک پر قبضہ کیا وہاں وہاں مقامی باشندوں نے حاکمِ وقت کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی جبر کے خلاف منظم تحریکیں چلائیں اور مقاصد کے حصول کے لیے ہر ممکن قربانیاں دیں۔ گویا اجتماعی مزاحمت کا ایک واضح نصب العین ہوتا ہے نتیجتاً اس قسم کی مزاحمت ایک انقلاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جس کی بہترین مثال انقلاب فرانس ہے، جو کہ 1789ء میں رونما ہوا تھا۔

اٹھارویں صدی میں فرانس کے تمام معاشی و سماجی وسائل پر امرا اور بادشاہوں کا قبضہ تھا اور درباروں میں عیاشیاں ہوتی تھی جب کہ غریب عوام افلاس کا شکار تھے اور بھوک سے بِلک بِلک کر مر رہے تھے۔ چونکہ کسان طبقہ ٹیکسوں کے بھنور میں جکڑا ہوا تھا۔ اس لیے ناانصافی واضح نظر آ رہی تھی۔ ان ناانصافیوں کے خلاف 14 جولائی 1789ء میں بیسیل جیل پر حملہ کر کے قیدیوں کو چھڑا کر انقلاب کا آغاز کر دیا گیا۔ انقلابیوں کو معلوم تھا کہ ان کا واضح دشمن کون ہے اور مقاصد کیا ہیں؟ یہ انقلاب اجتماعی کوشش کی زندہ جاوید مثال ہے۔ جہاں معاشرے کے متعدد افراد کے انفرادی مسائل مل کر تحریک کی صورت اختیار کر گئے۔

اگر اجتماعی مزاحمت کی مثالیں اسلامی حوالے سے دیکھی جائیں تو غزوات میں ملیں گی، جب مسلمانوں نے مل کر کفار اور یہود کی رکاوٹوں کو عبور کیا۔ پھر فتح مکہ اس کی سب سے بڑی مثال ہے، جب مسلمان ایک واضح مقصد کے حصول کی خاطر شانہ بشانہ لڑے اور ایک الگ اسلامی فلاحی مملکت کے حصول کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔

واقعہ کربلا بھی اجتماعی مزاحمت کی ایک بڑی مثال ہے۔ یزید کی پالیسیوں اور اس کے بے رحمی کی حد تک خراب کردار سے نالاں مسلمانوں نے امام حسینؓ کو مزاحمت پر آمادہ کیا۔ ایک بڑے مقصد کے حصول کی خاطر امام حسینؓ نے نہ صرف اپنی جان کی قربانی دی بلکہ اپنے پورے خاندان کو قربان کر دیا۔ یہ اجتماعی مزاحمت کی ایک ایسی یادگار اور لاجواب مثال ہے جس کی دوسری کوئی مثال نہیں ملتی۔

اجتماعی مزاحمت اور جدوجہد کی ایک اور واضح مثال انقلابِ روس (1917ء) کی ہے۔ فرانس کی طرح روس میں انقلاب سے قبل بادشاہت کا دور تھا۔ ملک میں صنعتی پیداوار وسیع پیمانے میں نہیں تھی۔ علاوہ ازیں عوام ٹیکسوں کے بوجھ تلے پِس رہے تھے۔ زرعی ملک ہونے کے باوجود عوام کا معیارِ زندگی پست تھا۔ مشہور اشتراکی نظریے کے حامی کارل مارکس نے پسماندہ عوام کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی اور معاشرے میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف مزاحمت کی، جس نے اپنے نظریے وسائل کی برابر تقسیم کی بات کی۔ روس میں لینن کارل مارکس کے نظریے کا بڑا پیروکار تھا، جس کی جدوجہد سے 1917ء میں روس سوشلسٹ ملک قرار پایا۔ دونوں تحریکیں اجتماعی مزاحمت کی عمدہ مثالیں ہیں کیونکہ دونوں ممالک میں عوامی

[26] ایضاً

مسائل ایک جیسے تھے۔[27]ہندوستان اور مشرق وسطی میں کسانوں کی اپنے حقوق کے حصول کے لیے چلائی گئی تحریکیں بھی اجتماعی مزاحمت کی مثالیں ہیں۔

موجودہ دور میں دیکھیں تو گزشتہ صدی میں قائد اعظم کی بے لوث قیادت میں مسلمانان ہند نے اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے ایک الگ وطن کے حصول کی خاطر بے مثل قربانیاں دیں اور ایک ایسا انقلاب لانے میں کامیاب ہوئے جس کا انجام دو الگ ریاستوں کے قیام پر منتج ہوا۔ یہ سب اجتماعی مزاحمت کی کامیاب مثالیں ہیں۔

عملی مزاحمت کی دو صورتیں:

مزاحمت کی عملی طور پر دو اشکال موجود ہیں۔ ان میں سے ایک صورت وہ جو عمومی طور پر زندگی میں پائی جاتی ہے۔ معاشرے میں کسی ظالم، غاصب کے خلاف کھڑے ہو کر جسمانی مزاحمت کرتے ہوئے ہتھیار تک اٹھالینا ہے۔ موجودہ عہد میں مشرقی سماج میں غربت اور سماجی شعور کی کمی کے باعث اس عملی مزاحمت کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔

دوسری صورت نہایت پیچیدہ اور خالص داخلی ہے۔ مزاحمت کی اس صورت میں معاشرے کا حساس طبقہ یعنی ادیب چاہے وہ کسی بھی زبان میں ادب تخلیق کر رہے ہوں اپنے قلم کا استعمال کرتا ہے اور ظلم، جبر اور عوامی استحصال کے خلاف لفظوں کی جنگ لڑتا ہے۔ اُردو میں ادیبوں نے پہلے نوآبادیاتی نظام کے خلاف دبے دبے الفاظ میں اظہار کرنا شروع کیا۔ پھر غدر کے واقعے کے بعد مسلمانوں کے استحصال کے خلاف لفظی مزاحمت کی۔ تاریخ گواہ ہے کہ انسان اپنی بقا کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہا ہے اور اس کی جہدِ مسلسل متعدد حوالوں کے خلاف جاری رہی ہے کہیں ماحولیاتی نامساعد حالات تھے اور کہیں خود انسان ہی انسان کے خلاف ناانصافی، ظلم اور جبر کا مرتکب ہوتا رہا۔ یہاں راقم چند ایسی بنیادوں کا ذکر کرے گا، جو امن پسند سماج میں انسان کو مزاحمت کے لیے مجبور کرتی ہیں۔ ڈاکٹر آغا ظفر حسین نے اپنی کتاب "مزاحمت اور پاکستانی اُردو شاعری" میں مزاحمت کی ممکنہ اقسام گنوائی ہیں۔ راقم کے نزدیک مزاحمت کے جواز کی ممکنہ بنیادوں میں، معاشی جبر، سیاسی جبر، نسائیت، تاریخی جبر، تہذیبی اور سماجی جبر، لسانی جبر اور نفسیاتی جبر شامل ہیں۔

معاشی ناہمواری کے خلاف مزاحمت:

حرص و ہوس انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ زیادہ سے زیادہ مال و دولت کی خواہش انسان کو انسان سے حیوان بنا دیتی ہے یوں کئی لوگ امیر سے امیر تر ہوتے چلے جاتے ہیں اور جن کا معیار زندگی پست ہوتا ہے ان کا مزید گر جاتا ہے۔ معاشرے میں عیش و عشرت کی زندگی گزارنے والا امرا اور بادشاہت طبقہ دیگر انسانوں کو انسان ہی نہیں سمجھتا ہے جب کہ غربت سے بھی پست زندگی بسر کرنے والا طبقہ دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانپنے کے لیے لباس کو بھی ترس جاتا ہے، جو معاشرے میں طبقاتی تقسیم اور معاشی ناہمواری اور غربت میں پسے طبقے میں مزاحمت کی لہر پیدا کر دیتی ہے۔ اس ضمن میں تیسری دنیا کے ممالک سر فہرست ہیں، جہاں زیادہ تر استعماری قوتیں قابض ہیں۔ جہاں یہ قوتیں دفاعی طاقت اور دنیا میں اپنا اثر قائم رکھنے کے لیے سرمایہ پانی کی طرح بہاتی ہیں لیکن یہ سرمایہ غربت سے گھرے عوام کا معیار زندگی بلند نہیں کرتا، مشرق وسطی کے کئی ممالک جن میں ہندوستان، افغانستان، عراق، مصر اور پاکستان وغیرہ جیسے ممالک ایسی غربت کا شکار ہیں۔

---

[27]روبینہ سہگل، **عورت اور مزاحمت** (لاہور: مشعل پبلی کیشنز، 1999ء)، 22۔

تاریخ معاشی جبر کے خلاف مزاحمت سے بھری پڑی ہے مگر بیسویں صدی میں نو آبادیات کے خلاف انقلاب فرانس اور روس اس کی دو بڑی اہم مثالیں ہیں۔ڈاکٹر آغا ظفر حسین اپنی کتاب میں معاشی جبر کے خلاف مزاحمت کے حوالے سے ان دونوں مثالوں کا حوالہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"معاشی جبر کے خلاف مزاحمت سے یوں تو تاریخ انسانی بھری پڑی ہے مگر۔۔۔۔انقلابِ روس اس اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ خالص مادی نظریات پر مبنی معاشی استحصال اور اس سے نجات کی تھیوری کے تحت وسیع و عریض ریاست کی تشکیل عمل میں آئی۔زندگی کے تئیں ترقی پسندانہ نقطۂ نظر رکھنے والے اور دبے کچلے عوام نے اس انقلاب سے inspire ہو کر اپنے ملکوں میں آزادی اور معاشی عدم مساوات کی جو جدوجہد کی اس بنا پر ایک زمانے میں آدھا گلوب سوشلسٹ نظام حکومت کے تحت آ گیا تھا"[28]

یہ مزاحمت محض انقلاب روس اور فرانس تک محدود نہیں ہے بلکہ عہد حاضر میں بھی معاشی جبر کے خلاف انفرادی اور اجتماعی مزاحمت جاری ہے ۔انفرادی مزاحمت میں ہمیں معاشی استحصال میں مبتلا طبقہ متعدد جرائم کے ذریعے اپنی غربت کو مٹانے کے جتن کرتا نظر آتا ہے۔ حتیٰ کہ حالات اس نہج پر پہنچ گئے ہیں کہ آئے دن اخبارات میں یہ خبر شایع ہوتی ہے کہ غریب شخص نے معاشی تنگ دستی کے سبب اپنے معصوم بچوں کا گلا گھونٹ کر خود کشی کر لی۔اگر دنیا کو اجتماعی مزاحمت کے تناظر میں دیکھیں تو کئی ممالک میں معاشی جبر کے خلاف متعدد تحریکیں احتجاج اور مزاحمتی رویہ اپنائے ہوئے ہے۔شکاگو میں مزدوروں کا یکم مئی کو ہونے والا احتجاج بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔

ریاستی جبر کے خلاف مزاحمت:

انسان کے چند ایک پیدائشی حقوق ہیں، جن میں سے ایک شخصی آزادی ہے۔جب اس کی شخصی آزادی کی راہ میں ریاست مزاحم ہو تو ایسی مزاحمت ریاستی جبر کے خلاف مزاحمت تصور کی جاتی ہے۔اگر ہم کرہِ ارض پر نگاہ ڈالیں تو کسی نہ کسی سطح پر ریاستی جبر موجود ہے۔اس کی مختلف صورتیں ہیں کہیں یہ مزاحمت شہنشاہت کے خلاف اور کہیں یہ فوجی آمریت کے خلاف عیاں ہے۔

اگر تاریخ کا مطالعہ کریں تو مطلق العنان شہنشاہوں نے کسی حد تک انسانوں کے شخصی حقوق کو پامال کیا ایسے ایسے واقعات گزرے ہیں، جن کو دہرانے سے روح کانپ اٹھتی ہے شہنشاہت اور مطلق العنانیت کی گھٹن نے نسلِ انسانی کو مزاحمت پر اکسایا اور انھوں نے شہنشاہت اور فوجی آمریت کو رد کرتے ہوئے سیاسی جمہوریت کو منتخب کیا۔اسی وجہ سے آج دنیا کے بیشتر ممالک میں جمہوریت موجود ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک کا بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں جمہوریت ہونے کے باوجود غربت، ناانصافی اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف مزاحمت روز کا معمول ہے۔ان ممالک میں جمہوریت محض انتخابی عمل تک محدود ہے ۔جمہوریت کے ثمرات نچلے طبقے تک نہیں پہنچ پا رہے یوں غربت، بے چینی، ظلم و ستم اور شخصی آزادی کا سلب ہونا بغاوت کو جنم دے رہے ہیں۔ریاستی جبر کے خلاف مزاحمت کئی صورتوں میں کی جاتی ہے۔ڈاکٹر آغا ظفر حسین نے ریاستی جبر کے خلاف مختلف رویوں کا ذکر کیا ہے:

:1 ملک کے کسی مخصوص طبقے کسی مذہبی، لسانی اور علاقائی گروہ کے جائز حقوق کی طرف سے ریاستی رُوگردانی۔

:2 انتخابی عمل میں مداخلت کرنا۔

---

[28] آغا ظفر حسین، **مزاحمت اور پاکستانی اُردو شاعری** (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2006ء)، 25۔

3: ذرائع ابلاغ پر قدغن یعنی ادیب و دانشور کو آزادی اظہار سے روکنا اور حکومتی موقف کی مبالغہ آمیز حد تک تشہیر۔

4: ملک کے تعلیمی، ثقافتی اور دوسرے اہم اداروں میں حکومت سے اختلاف رکھنے والے لوگوں کی حوصلہ شکنی کرنا۔

5: کسی بھی معاملے میں حکومت کے مخالفین کو بے جا ہراساں کرنا اور ان کو باغی قرار دینا۔

6: اہم قومی اور بین الاقوامی مسائل پر اکثریت کو نظر انداز کر کے یک طرفہ فیصلے کرنا۔

7: عوامی رجعت پسندی کو فروغ دینا۔

8: احتجاجی مظاہروں پر پابندیاں لگانا۔[29]

ریاستی جبر کی یہ صورتیں کم و پیش ترقی پذیر ممالک ہوں یا پسماندہ کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔ اس دنیا کا غائر مطالعہ کیا جائے تو آئے روز احتجاج ، بغاوت کی صدائیں سنائی دیتی رہتی ہیں۔

سیاسی جبر کے خلاف مزاحمت:

دینا میں جب نو آبادیاتی نظام کو زوال ہوا اور دنیا کو ایک نئی طرز کے حالات کا سامنا کرنا پڑا یعنی دنیا دو بڑی طاقتوں کے باہمی تصادم کا شکار نظر آئی۔ سرمایہ دارانہ نظام کے حامی امریکہ اور سوشلزم کے حمایتی سوویت یونین نے اپنا اپنا نظریہ دنیا پر تھوپنے کے لیے کئی اوچھے ہتھکنڈے استعمال کیے ۔ سرد جنگ اور ہتھیاروں کی دوڑ نے دنیا کو تیسری عالمی جنگ کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔

دنیا کی کم و بیش تمام سیاسی حکومتوں میں ان دو بڑی طاقتوں کی بنیادی یا ثانوی مداخلت موجود ہوتی ہے۔ طاقتور ممالک میں ان دونوں کا مقابلہ کرنے کی سکت تھی لیکن تیسری دنیا کے ممالک ان کی ریشہ دوانیوں کا بری طرح سے شکار ہوئے برصغیر میں رونما ہونے والے اہم حالات کے پیچھے (سی۔ آئی۔ اے) اور (کے۔ جی۔ بی) کی سازشوں کی کار فرمائی رہی۔ تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی حکمت عملی کے تحت یہاں کے چھوٹے بڑے تضادات کو ہوا دی جاتی رہی نیز پڑوسی ملکوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہونے پر مجبور کیا جاتا رہا اور اس تصادم کی آڑ میں ان دونوں ممالک نے اپنے اپنے مفادات پورے کیے۔

بیسویں صدی میں وقت کے کروٹ کے ساتھ سوویت یونین کا خاتمہ ہوا اور امریکہ تن تنہا دنیا پر حکمرانی کے خواب دیکھنے لگا۔ جب چاہتا اور جہاں چاہتا فوجی کارروائی کر ڈالتا، جس کی سب سے بڑی مثال عراق اور افغانستان ہیں، جہاں آج بھی اس کی افواج موجود ہیں۔ امریکہ کی اس پالیسی کو دیکھ کر ترقی یافتہ ممالک اور اقوام متحدہ بھی لاچار ہیں۔ اس کی یہ پالیسی عراق اور افغانستان سے بڑھ کر ایران، لبنان، شام اور مصر کو بھی اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ مختصر یہ کہ امریکی رویے نے تمام دنیا کو عدم تحفظ سے دوچار کر دیا ہے۔

اس سیاسی جبر کے خلاف ترقی پذیر ممالک میں مزاحمت پائی جاتی ہے۔ تیسری دنیا کے عوام میں امریکہ کے خلاف نفرت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں بلکہ جب یہ نفرت بغاوت کا روپ دھارتی ہے تو مزاحمتی تحریک جنم لیتی ہے۔ امریکی منافقانہ رویے نے دنیا کو کسی بڑی تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ عام فرد کی متشدد سوچ کا ذمہ دار امریکہ ہے۔ چنانچہ بیسویں اور اکیسویں صدی میں ادبا اور شعرا کے قلم کی سیاہی بھی اس جبر کی گواہی دیتی ہے۔

---

[29] ایضاً، 26-27۔

دوسری طرف دنیا میں ایسے عرب ممالک ہیں جہاں آج بھی شہنشاہت قائم ہے اور کئی اسلامی ممالک نے جمہوری نظام اختیار کیا ہے لیکن اس کو ارتقا ودوام حاصل نہیں وہاں جمہوریت محض اقتدار کی سیڑھی ہے وہاں بھی عوامی سطح پر انفرادی اور اجتماعی مزاحمت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

سیاسی جبر کا ایک رخ سیاسی بدعنوانی بھی ہے۔ سیاسی بدعنوانی سے مراد سیاست دانوں کا منفی اور ناپسندیدہ فعل ہے۔ اس کی بڑی وجہ سیاست دانوں کا غیر جمہوری رویہ ہے۔ سیاست دان عوامی خدمت کا نعرہ لگا کر منتخب تو ہو جاتے ہیں لیکن بعد ازاں انھیں صرف اقتدار سے دلچسپی ہوتی ہے اور وہ عوامی مسائل میں عدم دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔ یہ وہ حقائق ہیں، جو جمہوری حکومت میں سیاست کا طرہ امتیاز بن چکے ہیں۔ سیاست دانوں کے اس رویے کے متعلق ڈاکٹر ظفر حسین لکھتے ہیں: "سیاست دانوں کی عوامی مسائل سے دلچسپی، رشوت ستانی، عیش پرستی، ضمیر فروشی، اخلاقی پستی، سیاسی جماعتوں کی فرقہ پرستی، نسل پرستی اور ذات پات کی پالیسی، سیاست کا مجرمانہ، مجرموں کا سیاسیانہ، یہ وہ چند حقیقتیں ہیں جو اس عہد کی سیاست کا خاصہ بن چکی ہیں"[30]

اس سیاسی ناہمواری اور سیاست دانوں کے منفی رویے نے عوام کو بغاوت، احتجاج اور تحریک چلانے پر مجبور کیا ہے۔ آج کا سیاست دان اس لیے منتخب نہیں ہوتا کہ اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لا کر عوامی مسائل حل کرے گا بلکہ اس کا مقصد اقتدار کا حصول اور اقتدار ملنے کے بعد اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھانا ہے۔ قومی دولت کو اپنی جاگیر سمجھ کر لوٹ لینا، اپنے اختیارات کو غربت کی ماری عوام کا معیار زندگی اور پست کرنا ان کے اقتدار میں آنے کے مقاصد ہیں۔ معاشرے میں یہ تمام صورتِ حال بغاوت جنم لینے کے اسباب ہیں۔ عوام اس ناانصافی کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں اور تخلیق کار قلم کی نوک سے وہ الفاظ لکھتے ہیں، جو عام انسانوں کی باطن کی آواز ہوتے ہیں۔

عورت کی مرد کے خلاف مزاحمت:

خداوندِ کریم نے انسانوں کو دو روپ میں خلق کیا ہے۔ ایک مرد اور دوسری عورت۔ دونوں کے الگ الگ حقوق اور فرائض بھی مقرر کر دیے ہیں چونکہ انسانی سماج مرد اور عورت کے وجود پر مشتمل ہے اس لیے ان دونوں کے وجود کی بقا اور ترقی ہی میں حقیقی طور پر انسانی سماج کی ترقی ہے۔[31] قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ[32]

"عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں"

مرد عورت سے جسمانی طور پر طاقت ور ہوتا ہے۔ اس لیے ازل سے لے کر اب تک مرد عورت کا استحصال کرتا نظر آیا ہے۔ مشرقی سماج میں اس کی کئی وجوہات ہیں۔ چونکہ عورت مرد کی پسلی سے تخلیق ہوئی اس لیے عورتوں کو ذہنی اور جسمانی طور پر کم تر خیال کیا جاتا ہے۔ مشرقی سماج میں عرب سے قبل جاہل معاشرے کی سوچ بھی پروان چڑھتی نظر آتی ہے۔ جہاں پر بیٹے کی پیدائش پر تو خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے جبکہ لڑکی کی پیدائش پر مایوسی کا اظہار بعد ازاں ماں کو ہی قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہمارے سماج میں عورت پر گھر سے یا معاشرے سے بے جا پابندیاں لگتی ہیں تو عورت کی طرف سے مزاحمت کی کئی صورتیں عیاں ہوتی ہیں۔

---

[30] آغا ظفر حسین، **مزاحمت اور پاکستانی اُردو شاعری** (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2006ء)، 30۔

[31] طاہرہ کوکب، **عورت کی سماجی و معاشی زندگی** (لاہور: کتاب سرائے پبلی کیشنز، 2018ء)، 152۔

[32] **البقرة** 228:02

1: عورت جب سن بلاغت کی عمر میں قدم رکھتی ہے تو والدین اس سے پوچھے بغیر ہی شادی طے کر دیتے ہیں۔اس صورت میں اگر لڑکی تعلیم یافتہ ہے یا شعور رکھتی ہے تو انکار کی صورت میں مزاحمتی انداز اپناتی ہے۔

2: چونکہ عورت حیا کا پیکر ہوتی ہے اس لیے وہ اپنے باطن میں جنسی جذبات پر ضبط رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔لیکن شادی کے بعد مشرقی عورتیں اپنے خاوند سے جنسی ملاپ کرتے وقت ناکام مزاحمت کرتی رہتی ہے۔

3: عمومی طور پر گھروں میں لڑائی جھگڑے کے اسباب مالی حالات ہوتے ہیں مالی تنگ دستی کے سبب مرد چڑ چڑا ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے چھوٹی سی غلطی پر بھی بیوی کو تشدد کا نشانہ بناتا ہے، جس کے جواب میں بعض اوقات مزاحمت کرتی ہے اور اگر عورت خود مختار ہو تو مرد اس کی عام سی بات کا یہ مطلب نکال لیتا ہے کہ وہ برتری ظاہر کر رہی ہے جس کے نتیجے میں وہ روایتی مرد بن کر تشدد کرتا ہے۔روبینہ سہگل لکھتی ہیں:

"موجودہ زمانے نے مرد کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ تشدد سے بھرپور طریقے سے اپنی مردانگی کو۔۔ہر دم دوسروں پر برتری ظاہر کی جا سکتی ہے اور خوف طاری کیا جا سکتا ہے۔کمانے والی خود مختار بیوی کو مار پیٹ کر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ بے شک وہ کماتی ہے لیکن گھر میں وہ پاؤں کی جوتی ہے اور اسے اپنی حیثیت پہچان لینی چاہیے"[33]

مذہبی انتہا پسندی اور مذہبی ریاکاری کے خلاف مزاحمت:

دنیا کے تمام مذاہب امن، حقوق انسانی، بھائی چارے اور رواداری کا سبق دیتے ہیں۔لیکن ہر مذہب کے پیروکار اپنے مذہب کو افضل کہلوانے کے دعویدار ہیں۔جب کسی بھی مذہب کی تشریح اپنے انداز میں کرتے ہیں تو مذہبی انتہا پسندی جنم لیتی ہے۔یہ انتہا پسندی کم پڑھے لکھے افراد کے مذہبی عقائد کو گمراہ کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔اسلامی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جن کے سبب اسلامی سلطنت مستحکم ہوئی لیکن موجودہ عہد میں نام نہاد ملاّ نے مذہب کی اپنی ڈھب کی تشریح کر کے افراد کو گمراہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔فرقوں اور مسلکوں میں بٹی مسلمان قوم مسلک کی بنیاد پر مذہبی افتراق کے خلاف مزاحمت کرتی ہے۔جس کے سبب معاشرے میں فسادات، اقلیتی فرقوں کی تضحیک اور ریاستی اداروں کے املاک کی توڑ پھوڑ ہوتی ہے۔

ہر مذہب میں چند بنیادی رسومات ہوتی ہیں، جن کی ادائیگی پر زور دیا جاتا ہے لیکن ان کی ادائیگی کے وقت اخلاقی اقدار کی پامالی کی جاتی ہے اور ادائیگی میں ظاہر داری عیاں ہوتی ہے، جیسے مسلمانوں کے ہاں نماز، روزہ، حج، تلاوت کرتے ہیں۔ہندوؤں میں گنگا نہانا اور دیوی آرتی کرتے ہیں اور عیسائی ہر اتوار کلیسا میں اجتماعی عبادت کا اہتمام کرتے ہیں۔ان فرائض کی ادائیگی میں خالص مقصد عرفان الٰہی کے قرب کا حصول ہونا چاہیے لیکن ادائیگی میں دکھاوا نمایاں ہوتا ہے اور ان کے ظاہر و باطن میں تضاد ہوتا ہے تو ہر مذہب کا باشعور طبقہ اس روش کے خلاف مزاحمت کرتا نظر آتا ہے۔

تاریخی جبر کے خلاف مزاحمت:

عام انسان اور تخلیق کار جس عہد سے بھی تعلق رکھتے ہوں وہ اپنی گفتگو اور فن پاروں میں تاریخ میں پیش آنے والے ناخوشگوار واقعات کے حوالے سے ناآسودگی کا اظہار کرتے ہیں۔تاریخ ایسے عالمی واقعات سے بھری پڑی ہے، جن سے انسانی زندگی براہ راست متاثر ہوئی۔واقعہ کربلا اس کی

---

[33] روبینہ سہگل، **عورت اور مزاحمت** (لاہور: مشعل پبلی کیشنز، 1999ء)، 38۔

سب سے بڑی مثال ہے۔ جب امیر معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو جو ہر لحاظ سے نااہل تھا، خلیفہ بنایا تو اس کا ردعمل سامنے آیا جس کے نتیجے میں حضرت امام حسین نے اپنے خاندان سمیت جان قربان کی۔ اس سے پہلے امام علیؑ کو امیر معاویہ اور خوارج کی طرف سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت پر مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہوئے۔ اندرونی خلفشار بڑھا تو دشمنوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا یوں بغاوت ہوئی۔

712 عیسوی میں ایک مسلمان لڑکی کی پکار پر راجہ داہر کے خلاف محمد بن قاسم لشکر لے کر سندھ میں آتا ہے اور راجہ داہر کی ظالمانہ حرکات پر مزاحم ہوتا ہے۔ تقسیم سے قبل جنگ آزادی، عالمی جنگیں، ہجرت کا کرب، پاک بھارت جنگیں، سقوط ڈھاکہ ایسے واقعات ہیں جنھوں نے برصغیر پاک وہند کے ہر باسی کی زندگی کو متاثر کیا۔ مشرق میں اکیسویں صدی نائن الیون کا واقعہ ساتھ لے کر آئی جس کے نتیجے میں افغانستان اور عراق میں فوجی کارروائی جیسے واقعات تاریخ کے زمرے میں آتے ہیں۔ ہمارے ادبا اور شعرا نے ان واقعات سے متاثرہ زندگی کو مزاحمتی انداز میں پیش کیا ہے۔

سماجی تہذیبی جبر کے خلاف مزاحمت:

ہر خطہ ایک تہذیب رکھتا ہے، جس کے ذریعے وہ خطہ یا سماج ترقی کی منازل طے کرتا ہے لیکن اگر نامساعد حالات کے سبب کسی بھی استعماری قوت کا غلبہ آجائے تو وہ اس خطے کی تہذیب و ثقافت پر شب خون مارتی ہے۔ تاریخ کے اوراق پر ایسے کئی واقعات نقش ہیں جن میں فاتح یا طاقتور قومیں پسماندہ تہذیبوں پر غلبہ پا لیتی ہیں۔ دنیا میں پہلے یونانی تہذیب پھر اسلامی تہذیب اور بعد ازاں مغربی تہذیب کا غلبہ رہا۔[34] ہندوستان کی تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں بھی مشرقی تہذیب کو مغربی تہذہب نے کیسے پاش پاش کر دیا تھا۔

عہد حاضر کی نسلِ نو کو بھی مغربی تہذیب سے خطرہ لاحق ہے، جن کا جنم تو مشرقی خطے میں ہوا لیکن رہن سہن زندگی کے تمام رنگ مغربی تہذیب میں ڈھل رہے ہیں جس کے سبب کہیں اخلاقی اقدار اور انسانیت کے پست درجے پر پہنچ رہے ہیں۔ تہذیبی جبر بھی مزاحمت کو ہوا دیتا ہے، جو قومیں شعور رکھتی ہوں وہ کسی دوسرے خطے کی تہذیب کو نہ اپنا کر مزاحمتی انداز اپناتی ہیں۔

لسانی جبر کے خلاف مزاحمت:

تہذیب اور ثقافت کا اہم جزو زبان ہوتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جس علاقے یا تہذیب کو نامساعد حالات کا سامنا ہو وہاں لسانی جبر پروان چڑھتا ہے۔ اگر دنیا میں بولی جانے والی مختلف زبانوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مزاحمت کو پروان چڑھانے کا ایک ذریعہ لسانی جبر ہے۔ ایران پر جب عربوں نے حکمرانی کی تو فارسی کو لسانی جبر کا سامنا کرنا پڑا اسی طرح مغرب میں فرانس نے جب برطانیہ پر حکومت کی تو انگریزی کو متروک کر کے فرانسیسی کو عروج ملا۔ ہندستان میں فارسی سے ہندی، ہندی سے اُردو کو پروان چڑھایا گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اُردو کو قومی زبان کا درجہ ملنے کے باوجود لسانی تعصب کا سامنا کرنا پڑا۔

قیامِ پاکستان کے بعد لسانی جبر کی بڑی مثال بنگالی قوم کی طرف سے اس وقت سامنے آئی، جب قائداعظم نے 1948ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں اُردو کو پاکستان کی قومی زبان کا درجہ دیا تو بنگالی عوام غصے کی آگ میں جلنے لگے اور لسانی تعصب کی بنیاد پر تحریک چلائی، جو کہ وہاں کے طلبا نے شروع کی۔ عوام اور طلبا کی تین سال کی محنت کے بعد ہی 1951ء میں بنگال کی زبان بنگلہ قرار پائی۔

---

[34] آغا ظفر حسین، **مزاحمت اور پاکستانی اُردو شاعری** (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2006ء)، 34۔

تقدیر کے خلاف مزاحمت:

فطرت کے اصولوں کے خلاف چلنا بھی احتجاج یامزاحمت کے ذیل میں آتا ہے۔ مغربی ممالک میں ہم جنس پرستی کو قانون کی شکل دے دینا اس کی مثال ہے۔ کلوننگ کی صورت میں بھیڑ بنا کرنئے جاندار تخلیق کرنا بھی اس کی مثال ہے۔ انسان ایک حد تک قدرت کے اصولوں سے بغاوت کر سکتا ہے لیکن آخر میں جیت ہمیشہ قدرت کی ہی ہوتی ہے۔

نفسیاتی جبر کے خلاف مزاحمت:

کسی بھی فرد کو نفسیاتی حوالے سے دباؤ میں لانا نفسیاتی جبر کہلاتا ہے۔ چونکہ ہر عمل کا رد عمل ہوتا ہے اس لیے ایسے افراد جن کو نفسیاتی لحاظ سے دباؤ میں لایا جاتا ہے وقت آنے پر بھرپور مزاحمت کرتے ہیں۔ نفسیاتی جبر کے خلاف مزاحمت کرنے میں مددگار کے طور پر ماہر نفسیات بہت معاون ہوتے ہیں اور فرد کو انفرادی طور پر اس مصیبت سے نکلنے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔

مزاحمت کے بنیادی مباحث پر تفصیلاً بات کرنے کے بعد راقم کے نزدیک مزاحمت کی جامع تعریف درج ذیل ہے:

مزاحمت کو روک ٹوک، اعراض، ممانعت، احتجاج، فرار، مدافعت اور کئی دوسرے الفاظ کا ہم پلہ قرار دیا جاتا رہا ہے۔ مزاحمت دراصل ایک رویہ ہے۔ ایک ایسا عمل ہے، جو کسی بھی رکاوٹ کو دور کرنے کا ردِ عمل ہے۔ مزاحمت انسان کی سرشت میں موجود ہوتی ہے۔ انسانی شخصیت کا خاصہ ہے کہ وہ اپنی بقا کے لیے خواہ وہ ذہنی یا جسمانی مزاحمت کرتا رہا ہے۔ ہر اس شے سے جو اسے مٹانے تکلیف دینے کا باعث بنتی رہی ہو۔

گویا مزاحمت ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ خوشگوار زندگی گزارنے کے لیے، کامیابی کی سیڑھی عبور کرنے لیے، منزل کے حصول کے لیے ،اسے کائنات کی ہر اس شئے کے خلاف جدوجہد کرنا ہوتی ہے۔ جو اس کی منزل کے حصول میں رکاوٹ کا باعث بنے۔ مزاحمت کی تعریف متعین کرنے کے بعد اب اس کے دائرہ کار کا جائزہ لیتے ہیں کہ انسانی زندگی میں کن کن پہلوؤں سے مزاحمت اور احتجاجی رویہ اپنایا جا سکتا ہے۔

مزاحمت کا دائرہ کار:

مزاحمت کے متعلق جتنی بحث ہو چکی ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مزاحمت کوئی جز وقتی شے نہیں ہے۔ یہ ہمہ گیر معنی رکھتی ہے اور اس کا دائرہ کار وسیع تر ہے۔ اس کا تعلق محض انسان تک محدود نہیں۔ کائنات کا ذرہ ذرہ مزاحمت میں مصروف ہے اس کی چند ایک اشکال درج ذیل ہیں:

1: نیکی بدی کے خلاف مزاحمت کر رہی ہے۔

2: روشنی اندھیرے کے خلاف برسرِپیکار ہے۔

3: معاشرے کا ہر فرد خود کو انسان بنانے کے لیے اپنے نفس کے خلاف مزاحمت کرتا ہے۔

4: انسان اور شیطان کی کش مکش روزِ ازل سے جاری ہے۔

5: انسان کو زیست گزارنے کے لیے ہر اس شے سے برسرِپیکار ہونا پڑ رہا ہے، جو اس کو مٹانے کے درپے ہے۔

6: کائنات میں ہر فرد کسی نہ کسی مقصد کے حصول کے لیے کوشاں ہے اور مقصد کے حصول کی راہ میں ہر رکاوٹ کو دور کرتا چلا جاتا ہے۔

7: اکثر اوقات انسان ہی انسان کی بقا کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ یوں مظلوم شخص کبھی آہ و بکا کر کے اور کبھی ہتھیار اٹھا کر ظلم کے سامنے مزاحم بنتا ہے۔

8: مزاحمت کی ایک مثال ماں ہے خواہ وہ انسان کی ہو یا جانوروں کی ہو۔ ماں اپنے بچوں کی پرورش کے لیے، ان کی حفاظت کے لیے ہر اس عمل سے جنگ کرتی ہے، جس سے اس کے بچوں کو خطرہ ہو۔

9: مزاحمت کا دائرہ کار جب ذاتیات سے نکل کر اجتماعیت کی طرف بڑھتا ہے تو متعدد افراد اجتماعی مقاصد کے حصول کے لیے تحریکیں چلاتے ہیں اور اس سلسلے میں بغاوت اور احتجاج کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔

10: محکوم اور شکست خوردہ قومیں غلامی اور محکومی سے نجات کے لیے مزاحمت اختیار لیتی ہیں اور آزادی کے لیے ہر طرح کی قربانیاں دینے سے گریز نہیں کرتیں اور اس وقت تک احتجاج کا راستہ اپنائے رکھتی ہیں جب تک مقاصد کا حصول ممکن نہ ہو جائے۔

11: کسی بھی معاشرے میں جب جب جبر واستبداد روا ہوا تب تب مظلوم اور مجبور لوگوں نے اس کے خلاف بغاوت کی اور اس جبر کو مٹانے کی بھرپور جتن کرتے ہیں۔

12: عہد جدید میں انسانی زندگی میں الیکٹرونک، پرنٹ اور سوشل میڈیا کا بڑا عمل دخل ہے۔ ذرائع ابلاغ و مواصلات کے ذریعے معاشرے کے باسی ایک دوسرے کے نظریات سے جہاں اختلاف کرتے ہیں وہاں کوئی فرد یا گروہ اپنے نظریے کو افضل سمجھنے کے لیے مزاحمتی انداز اپناتے ہیں۔

مزاحمت کے اثرات:

مزاحمت کے انسانی معاشرے پر دوررس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اگر مزاحمت کا تصور نہ ہو تو غاصب اور سرمایہ دار غریب عوام کو چوس لیں۔ ان کی زندگیاں اجیرن بنادیں اور دکھ اور کرب کا عالم سکون کا ایک سانس لینا محال بنادے۔ یہ مزاحمت کا تصور ہی ہے جس کی وجہ سے معاشرہ توازن کی راہ پر گامزن رہتا ہے۔ کیونکہ جبر کرنے والا یہ جان لیتا ہے کہ اگر وہ غریب عوام کو یا اپنے ملازمین کو سہولتیں نہیں دے گا یا ان کا جینا حرام کر دے گا تو ایک وقت آئے گا، جب یہ جبر ان کی برداشت سے باہر ہو جائے گا اور وہ ان سرمایہ دار جابروں کی پالیسیوں پر عمل کرنے کی بجائے ان کے خلاف صف آرا ہو جائیں گے۔

مزاحمت کے انسانی زندگی پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں کیونکہ جب یہ زندگی کو برتنے کا فن سکھاتی ہے تو انسان خود بھی جیتا ہے اور دوسروں کو بھی جینے کی راہ دکھلاتا ہے۔ واقعہ کربلا کو دیکھ لیجیے۔ چودہ صدیاں قبل رونما ہونے والے اس دلدوز واقعے نے پوری نسل انسانی کو اپنی گرفت میں لیا۔ ہر قوم اور ہر نسل کے انسان نے اس دکھ کو سمجھا اور اس ظلم کے خلاف مذہب سے بالاتر ہو کر شعرا اور ادبا نے بات کی۔ واقعہ کربلا، ظلم کے خلاف مزاحمت کا ایک استعارہ بن کر سامنے آیا اور مظلوموں نے اس واقعے سے روشنی حاصل کر کے اپنے دیے جلائے۔

واقعہ کربلا میں ایک طرف امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے وفا اور جرات کی لازوال مثالیں قائم کیں تو دوسری طرف یزید کے دربار میں بی بی فاطمہؑ کی نہتی صاحبزادی بی بی زینبؑ نے بے مثال خطبہ دے کر کلمہ حق جس انداز میں کہا اس کی آواز رہتی دنیا تک ظالموں اور جابروں کی نیندیں حرام کرتی رہے گی۔ ہر مذہب اور ہر طبقے کے لوگوں نے اس روشنی سے اپنا دیا جلایا اور یوں مزاحمت کی مختلف مثالیں سامنے آتی رہیں۔ جس سے مزاحمت کے معاشرے پر مثبت اثرات کی نشاندہی آسانی سے ہو سکتی ہے۔

مزاحمت بطور ادبی اصطلاح:

کائنات کی تخلیق کے ساتھ اللہ تعالی نے حضرت آدمؑ کی تخلیق فرمائی۔ شیطانیت کو آدمیت کی سربلندی گوارانہ ہوئی اور اس نے نسلِ آدم کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور یوں انسان کی بدی کے خلاف مزاحمت کا آغاز ہوا۔ ابتدائی مزاحمت کی بہترین مثال ویدک عہد میں شنبوک کا پاک شلوکوں کی تلاوت کرنا ہے علاوہ ازیں 17 /ق م قدیم یونان کے ہیرو اسپارٹکس کی قیادت میں حکومت روم کے خلاف غلاموں کی بغاوت تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔[35] تاریخ گواہ ہے کہ روزِ ازل سے تاحال انسان کو بدی کی کن کن صورتوں کے خلاف مزاحمت کرنا پڑی یہ مزاحمت کئی صورتوں پر مشتمل رہی جو انحراف، جدوجہد، احتجاج اور بغاوت کی صورت میں ہوتی ہے اور انفرادی و اجتماعی مزاحمت کی صورت میں ابھرتی ہے۔ اس کی مثال یونانی فلسفی سقراط کی ہے، جس نے اپنے نظریات سے انحراف کرنے کی بجائے زہر کا پیالہ پی کر ریاست کے خلاف مزاحمت کی۔ ڈاکٹر انوار احمد مزاحمتی ادب کی اصطلاح کا نہایت مدلل انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مزاحمتی ادب ہمیشہ شعوری کاوش کا نتیجہ اور انسانی جدوجہد کے مثبت رخ کا آئینہ قرار دیا جاتا ہے۔ مزاحمتی ادب کی اصطلاح کا اطلاق استعمار کی گرفت میں جکڑے یا استعماری اثرات میں اسیر معاشرے کے باشعور فنکار کی مصلحت سوزی، با آواز بلند حق کی گواہی اور آنے والے کل کو اجلا اور روشن بنانے کے خواب کا اعتبار پیدا کرنے کی تخلیقی کاوش پر ہوتا ہے۔ تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ مزاحمتی ادب نے نہ صرف انسانی تہذیب و ثقافت کی بنیاد رکھی۔۔۔۔یہی وجہ ہے کہ ہر باشعور یا باضمیر تخلیق کار فطرتاً آزاد ہوتا ہے اور غلامی مسلط کرنے کی ہر صورت اور ہر کوشش کے خلاف مزاحمت کرتا ہے"[36]

اگر انسانی تاریخ پر نگاہ دوڑائیں تو ہماری تاریخ خون خرابے اور جنگ و جدل سے بھرپور دکھائی دیتی ہے۔ انسانی آزادی کو سلب کرنے والی قوتیں اپنے ہتھکنڈے پھیلاتی نظر آتی ہیں۔ ایک طرف قوت و طاقت کا بے جا استعمال اور دوسری طرف کمزور لاچار لوگ اپنی بقا کی جنگ لڑتے نظر آتے ہیں ۔ مزاحمت کی اصطلاح سب سے پہلے کب استعمال ہوئی اس کے متعلق ناقدین کی رائے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مزاحمت کو بطور اصطلاح سب سے پہلے جنگ عظیم میں استعمال کیا گیا ہے: "جرمنوں، اطالویوں اور جاپانیوں کے زیر تسلط ممالک کے لوگوں کو زیرزمین سرگرمیوں کو منظم مزاحمت سے تعبیر کیا گیا ہے ایسی مزاحمت نے غیر منظم لڑاکا قوتوں کو تشکیل دیا۔ جن میں فرانس کے میکولز(maqlis)اوس اور یوگوسلاویہ کے علیحدگی پسند وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن یہ اصطلاح خالصتاً شہری سرگرمیوں کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے جیسے کہ بیلجیم میں ایک زیرزمین چھاپہ خانہ تعمیر کیا گیا تھا جو کہ مقبوضہ جرمن حکام کی چوربازاری اور لوٹ مار کا ریکارڈ رکھتا تھا"[37]

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ مزاحمتی ادب کا آغاز جنگ عظیم اول میں اس وقت ہوا جب جرمنی نے سات سال تک تسلط جمائے رکھا، جس کے نتیجے میں فرانس میں مزاحمتی تحریکوں نے جنم لیا۔ ان تحریکوں سے وابستہ افراد مختلف پابندیوں میں اس قدر جکڑے ہوئے تھے کہ ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ جنگِ عظیم کے فاتح جرمنی کے خلاف مزاحمتی تحریکوں کے علاوہ وہاں کے ادبا اور شعرا نے بھی جرمن پروپیگنڈہ کو اپنی منظومات کے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔

---

[35] آغا ظفر حسین، **مزاحمت اور پاکستانی اُردو شاعری** (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2006ء)، 36۔

[36] انوار احمد، **عالمی مزاحمتی شاعری، مشمولہ، ماہ نو، جلد 41**، سہ ماہی (لاہور، 1989ء)، 23۔

[37] Girling, D.A. *New Age Encyclopedia*. Seventh edition. Sydney: Bay Books, 1983.

ادب اپنے عہد کی سیاست کی نمائندگی کرتا ہے کیونکہ دنیا کے متعدد انقلاب ادب کے اشاروں پر ہوئے۔ ادب کے ذریعے ہی معاشرے میں مقیم لوگوں کو انقلاب کے لیے اکسایا جاتا ہے۔ موجودہ عہد میں پاکستان کے قیام اور بنگلہ دیش وایران کی حکومتی سطح پر تغیرات میں ادیبوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ادب کے اشاروں پر حکومتوں کا تختہ الٹ دیا گیا۔[38]

استحصال اور جبر کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں معاشرے کا بالادست طبقہ غریب اور لاچار عوام کا استحصال کرتا چلا آرہا ہے۔ یہ جبر خواہ ریاستی، مذہبی، سیاسی یا معاشی ہو اس کے خلاف ہمیشہ احتجاجی آوازیں بلند ہوتی رہی ہیں ایسی آواز جو اپنے دور کے جبر کے خلاف اٹھے مزاحمتی آواز کہلاتی ہے اور اگر یہ آواز لفظوں کا روپ دھار لے تو تو مزاحمتی ادب تخلیق ہوتا ہے۔ اس ضمن میں قمر رئیس کا کہنا ہے: "ادب کا ایک قومی محرک اختلاف اور انحراف Dissent کا جذبہ بھی ہے"[39]

قمر رئیس کی رائے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ جبر، ظلم کے خلاف تحریر کردہ ادب مزاحمتی ادب کہلاتا ہے۔ شاعر اور ادیب معاشرے کا حساس ترین طبقہ ہوتا ہے چنانچہ معاشرے میں ہونے والا ظلم وستم، جبر واستبداد اور معاشرتی ناہمواری ان پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے اور یوں معاشرے کا یہ طبقہ مزاحمت کرنے لیے قلم کا سہارا لیتا ہے، جس کے نتیجے میں مزاحمتی ادب تخلیق ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں: "مزاحمتی ادب جدید دور کی اصطلاح ہے مگر مزاحمتی رویہ اور اس پر مبنی سوچ اور احساس بے حد قدیم ہے۔ غالباً اتنی ہی قدیم جتنی انسان کی آزاد رہنے کی خواہش۔۔۔۔ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کے زیر تسلط علاقوں بالخصوص فرانس میں جرمن اقتدار کے خلاف قوم پرست۔ آزادی پسند اور محبِ وطن افراد نے جو زیر زمین تحریک شروع کر رکھی تھی، اس لیے یہ سب لفظ استعمال ہوتے تھے اور کم وبیش اسی مفہوم میں یہ مروج ومقبول رہے تھے"[40]

مزاحمتی ادب کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی جب ادیب یا شاعر اپنی کسی ذاتی تکلیف یا دکھ کو سامنے لائے جو کہ انفرادی مزاحمت کے زمرے میں آتا ہے۔ دوسری صورت کا تعلق معاشرے کی مجموعی صورت کو ادب کا حصہ بنانا ہے، جس میں ادیب اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے وسیع تر مفاد کے پیشِ نظر سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی استحصال کی آواز اٹھاتا ہے: "ادب تخلیق کرنا بذات خود ایک مزاحمتی عمل ہے کیوں کہ ادیب اپنے گردوپیش سے اغماض نہیں کرپاتا اور اس کش مکش کی بنیاد پر وہ ادب تخلیق کرتا ہے ایک طرح سے تو سارا ادب مزاحمتی ہے اور ہر ادیب باغی ہے"[41]

ادیب اور شاعر اپنے ماحول سے الگ ہو کر نہیں لکھ سکتا اس لیے کہ ادب زندگی کی شرح وتنقید ہے ہر فن پارہ اپنے ماحول کی نمائندگی کرتا ہے، جس میں تخلیق کار زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے یعنی ادیب اپنے فرائض کی انجام دہی بہ خوبی کرتا رہا ہے۔ بعض اوقات ظاہری طور پر اور بعض اوقات علامتوں اشاروں کنایوں اور مختلف صنائع بدائع کے ذریعے اپنی بات شعری اور نثری پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ یہ علامتیں دراصل کوڈز ہوتے ہیں۔ جن کے ذریعے شاعر یا ادیب بات کا اظہار کرتا ہے۔

---

[38] توقیر احمد خان، **احتجاج کی منفرد آواز: اقبال**، **مشمولہ اُردو ادب احتجاج اور مزاحمت کے رویے (مرتب) ارتضی کریم** (دہلی: اُردو اکادمی، 2004ء)، 109۔

[39] قمر رئیس، **ادب میں اختلاف، انحراف اور احتجاج کی معنویت**، **مشمولہ اُردو ادب احتجاج اور مزاحمت کے رویے (مرتب) ارتضی کریم** (دہلی: اُردو اکادمی، 2004ء)، 20۔

[40] سلیم اختر، **اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (آغاز سے 2010ء تک)** (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2017ء)، 660۔

[41] ابرار احمد، **مزاحمتی ادب**، **مشمولہ مزاحمتی ادب (مرتب) رشید امجد** (اسلام آباد: اکادمی ادبیات، 1995ء)، 48۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مزاحمتی ادب کی اصطلاح نسبتاً نئی ہے اور اس کا اطلاق استعمار کی گرفت میں جکڑے یا استعماری اثرات میں اسیر افراد پر ہوتا ہے تاہم یہ امر حقیقت ہے کہ مزاحمتی ادب میں نا صرف انسانی تہذیب اور ثقافت کی بنیاد رکھی بلکہ اس کی زندگی کو مزاج بھی ادا کیا گویا ایک تو مزاحمت کا سلسلہ انسانی تہذیب و تمدن کے آغاز سے جاری ہوتا ہے اور دوسری طرف اسے استعماری قوتوں کے مقابل ایک موثر اور با معنی تخلیقی جدوجہد کے طور پر قبول کیا گیا چونکہ مزاحمتی ادب جبر واستحصال مخالف ادب ہوتا ہے۔[42] اسی طرح ابرار احمد کے نزدیک مزاحمتی ادب کی تخلیق جاری ساری ہے۔[43] ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا مزاحمتی ادب کے متعلق لکھتے ہیں: "مزاحمتی ادب سے مراد وہ ادب ہے جو معاشرے کو جبر، ناانصافی، ظلم، تشدد وغیرہ سے نجات دلانے کے لیے ظلم سے آمادۂ جنگ کرتا ہے تو ہر لکھنے والے کی کوئی نہ کوئی تحریر اس ضمن میں شمار کی جاسکتی ہے"[44]

جدید ادب میں مزاحمت کا رویہ دوسری جنگ عظیم کے دوران سامنے آیا اگرچہ انسان اور مزاحمت کا ساتھ روزِ ازل سے موجود ہے تاہم اس نے دوسری جنگ عظیم میں تحریک پکڑی۔ دوسری جنگ عظیم میں فرانس کو شکست ہوئی اور وہ سات سال تک جرمنی کے زیر تسلط رہا اس دوران فرانسیوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹے ہر طرح کی آزادی سلب کر دی گئی۔ تحریر و تقریر اور کتب خانوں کے علاوہ نشر واشاعت پر بھی قدغن لگائی گئی۔ اس عمل کے خلاف بھی مزاحمتی رویہ نظر آتا ہے۔ ایسے حالات میں فرانس میں مختلف تنظیمیں وجود میں آئیں جنھوں نے ہٹلر کی بے جا پابندیوں کے خلاف مزاحمت کی اس مزاحمت میں عوام، ادیب، دانش ور اور صحافی سبھی طبقوں کے لوگ شامل تھے۔ فرانس کے خفیہ اخبار combat نے اس تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی عہد میں فرانس میں مزاحمتی ادب تخلیق ہوا۔ اس دور کا بڑا نام فرانسیسی ڈرامہ نگار اور فلسفی ژاں پال سارتر کا ہے۔ جس نے "اندھی گلی"، "، مکھیاں" وغیرہ کے عنوان سے مزاحمتی ڈرامے تحریر کیے۔ اس کے بعد "کامیو" کا ناول "طاعون "منظر عام پر آیا جو کہ مزاحمتی ادب کی بہترین مثالیں ہیں۔ مزاحمتی ادب کے حوالے سے چند ایک دیگر نام عالمی منظر نامے پر جلی حروف میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں پال رابسن، پابلو پکاسو، البیئر کامیو، میکسم گورکی، ٹالسٹائی، چیخوف، وغیرہ شامل ہیں جب کہ برصغیر میں لکھے جانے والے ادب میں مزاحمتی شاعری کے حوالے سے قُرۃ العین طاہرہ، فروغ فرخ زاد، ناظم حکمت وغیرہ کے نام نمایاں ہے، جن کی تخلیقات نے معاشرے میں شعور بخشا گویا مزاحمتی ادب کے حوالہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادیب طبقہ کسی بھی سماج سے تعلق رکھتا ہو وہ اپنے سماج میں جبر واستبداد، استحصال اور ناانصافی کے خلاف قلم کی طاقت کا بے دریغ استعمال کرتا ہے اس ضمن میں ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں: "مزاحمتی ادب سے تعلق رکھنے والے ادیب و شاعر اور دانشور اپنی حکومتوں اور حکمران طبقوں کے جرائم کو دیکھ کر خاموش نہیں ہوتے بلکہ وہ ان کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور انہیں دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کرب اور اذیت کا احساس دلاتے ہیں کہ جس سے لوگ دوچار ہوتے ہیں اور یہی احساس ان جرائم کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرتا ہے اور ان کے خلاف تحریک چلتی ہے"[45]

گویا ہر معاشرے کا ادیب طبقہ ہی اپنی حکومتی پالیسیوں اور معاشرے میں جنم لینے والے سماجی مسائل کے خلاف قلم کی طاقت سے احتجاج کرتا ہے۔ اس ضمن میں جو ادب تخلیق ہوتا ہے۔ سماج اسے مزاحمتی ادب کی صف میں رکھتا ہے۔

---

[42] آصف قادری، شفیق احمد، **اُردو میں مزاحمتی شاعری کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی اُردو** (بہاول پور: اسلامیہ یونیورسٹی، 2005ء)، 34۔

[43] **مزاحمتی ادب، مشمولہ مزاحمتی ادب (مرتب) رشید امجد** (اسلام آباد: اکادمی ادبیات، 1995ء)، 48۔

[44] خواجہ محمد ذکریا، **اُردو نظم کے پچاس سال، مشمولہ پاکستان میں اُردو ادب کے پچاس سال (مرتب) نوازش علی** (راولپنڈی: گندھارا بکس، 2007ء)، 83-84۔

[45] مبارک علی، **مزاحمتی ادب، مشمولہ ماہ نو، جلد 41، سہ ماہی (کشور ناہید)** (لاہور، 1989ء)، 05۔